مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم)

سیرت و شخصیّت

علمی و عملی کارنامے ——— اور

حضرت شیخ الہند کا ان سے خصوصی تعلق خاطر

——(مولانا سعید احمد اکبرآبادی مدظلہ کا ایک خطاب)——

© rasailojaraid.com

معزز حضرات! محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب! علمائے کرام! بزرگو اور دوستو! مولانا ابو الکلام آزاد ہماری ملت کے کاروان رفتہ کے ان پاسبانوں اور نگہبانوں میں سے تھے جن کا جب ذکر آتا ہے اور جب ان پر تقریر کرنے کے لیے کوئی مرحلہ سامنے آتا ہے تو عزیز لکھنوی کا وہ شعر بیساختہ یاد آجاتا ہے ؎

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا　　ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

اس لیے کہ ان کے ساتھ جو پرانی یادیں وابستہ ہیں اور جو پرانے واقعات ان سے متعلق ہیں، ان کا نام زبان پر آتے ہی وہ سب دل و دماغ میں اجاگر ہو جاتے ہیں اور ایک حسرت پیدا کرتے ساتھ ہی عہد گزشتہ میں لے جاتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد ان لوگوں میں سے تھے جن کو ہم عبقری یا GENIUS کہتے ہیں۔ اعلیٰ درجہ کی ذہانت و فطانت اور بلند درجہ کی قوتِ فہم و ادراک کے حامل تھے۔ میرا بچپن تھا جب مولانا کی شخصیت اور شہرت کا آفتاب نصف النہار پہ تھا۔ میں دیوبند میں پڑھتا تھا اور مولانا کے تذکرے اور چرچے سنتا تھا۔ گو مجھے دیوبند کے قیام کے عرصہ میں ان جلسوں میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ جن میں مولانا کی بڑی

© rasailojaraid.com

شاندار تقریریں ہوئی تھیں۔ اس لیے کہ میں طالب علمی کے زمانے میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتا تھا اور باہر کی دلچسپیوں سے زیادہ واسطہ نہیں رکھتا تھا۔ میرا سب سے پہلا اتفاق مولانا سے ملاقات کا ۱۹۳۶ء میں ہوا۔ اس کے بعد سے آخر وقت تک جبکہ مولانا اس دنیا سے رخصت ہوئے، مجھے ان کی خدمت میں بیٹھنے، ان کو قریب سے دیکھنے اور ان کی شخصیت کے مطالعہ کا بھی موقع ملا۔ اس بنا پر میں اس وقت آپ کے سامنے جو کچھ بھی عرض کروں گا، اس کے دو حصے ہوں گے۔ پہلا وہ جس کو میں نے اپنے بزرگوں، دوستوں اور ساتھیوں سے سنا ہے اور دوسرا حصہ ان واقعات پر مشتمل ہوگا جن کا میں نے خود ذاتی طور پر مشاہدہ کیا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے جو پیری مریدی کا گھرانا کہلاتا ہے جہاں بیعت کا رواج اور تصوف کا بڑا چرچا تھا اور مولانا آزاد کے والد بزرگوار کے عقیدت مندوں اور مریدوں کا ایک بڑا وسیع حلقہ تھا۔ لیکن مولانا آزاد کی طبیعت میں ان طور طریقوں سے بغاوت کے رجحانات شروع ہی سے تھے۔ انہوں نے اس طریقہ کو پسند نہیں کیا۔ ان کی تعلیم کہاں پر ہوئی اور کس طرح انہوں نے مختلف علوم پڑھے اس کی بھی کچھ زیادہ تفصیل نہیں ملتی ہے۔ لوگوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن مولانا نے اس کے متعلق خود جو آخری بات اپنی کتاب 'INDIA WINS FREEDOM' میں اپنے ذاتی حالات کے سلسلہ میں لکھی ہے۔ وہی میرے خیال میں زیادہ مستند سمجھی جانی چاہیے مولانا کی تعلیم کسی مستند اور باقاعدہ مدرسہ میں نہیں ہوئی۔ لیکن ان کے والد ماجد بہت بڑے بزرگ تھے اور ان کے حلقہ ارادت میں بڑے بڑے علماء داخل تھے جو صاحبان فن تھے اور خاص خاص فنون میں بڑی دستگاہ رکھتے تھے۔ ان کے والد ماجد نے مولانا کو بچپن ہی میں بغرض تعلیم مختلف علوم و فنون کے ماہر علماء کے سپرد کر دیا۔ مولانا نے علوم دینیہ و اسلامیہ اور فنون عربیہ کی تحصیل تو کی ہی تھی۔ لیکن دوسرے علوم و فنون میں ان کی وسعت نظر کا کیا حال تھا! اس کا اندازہ آپ کو اس سے ہو سکتا ہے کہ ہمارے ارباب علم اس بات کو جانتے ہیں کہ ابوریحان البیرونی کی ایک مشہور کتاب "قانون مسعودی" کے نام سے ہے یہ کتاب دقیق ریاضی یعنی HIGHER MATHAMATICS کی کتاب ہے جو لوگ ریاضیات میں بہت اونچا مقام رکھتے ہیں۔ وہی اس کتاب کو پڑھ اور سمجھ سکتے

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

ہیں۔ عام تعلیم یافتہ حضرات کی سمجھ میں اس کی بات آتی ہی نہیں ــــ میں نے متعدد لوگوں سے سنا تھا کہ مدرسہ عالیہ کلکتہ کے کتاب خانہ میں جس زمانے میں مدرسہ کے پرنسپل سر ڈینی سن راس تھے۔ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۱۰ء تک ایک نادر نسخہ 'قانون مسعودی' کا موجود تھا۔ نادر اس لیے کہ اس وقت تک اور شاید تاحال اس کے سوا کسی اور نسخہ کا پتہ نہیں چلا۔ مدرسہ عالیہ کی لائبریری اپنے بعض نوادرات کے اعتبار سے خاص خصوصیت رکھتی تھی۔ بتایا جاتا ہے۔ کہ ایک روز سر ڈینی سن راس جو لائبریری کے انچارج بھی تھے اور جنہوں نے یہ قانون بنا رکھا تھا کہ کوئی شخص بھی جو سولہ سال سے کم عمر کا ہو اس لائبریری سے استفادہ نہیں کر سکتا۔ ایک روز چپڑاسی نے آکر اطلاع دی کہ ایک تیرہ چودہ سال کا خوبصورت سا لڑکا کہتا ہے کہ میں لائبریری میں قانون مسعودی کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں۔ Sir Ross کو بڑا تعجب ہوا، اس نے اس لڑکے کو اپنے پاس بلایا۔ وہ تھے مولانا ابوالکلام آزاد۔ ان سے سر راس نے کہا میاں صاحبزادے! آپ کیا دیکھنا چاہتے ہیں! انہوں نے جواب دیا قانون مسعودی۔ سر راس نے پوچھا کیا آپ اسے پڑھ اور سمجھ سکتے ہیں! مولانا نے کہا کہ جناب والا آپ کتاب منگا لیجئے اور کوئی صفحہ مجھے بتائیے اگر میں اس کو پڑھ کر آپ کو سنا دوں اور اس کا مطلب بیان کر دوں، تو مجھے اس کے مطالعہ کی اجازت ملنی چاہیئے۔ چنانچہ سر راس نے یہی کیا انہوں نے اپنی کوٹھی میں جہاں مولانا سے یہ گفتگو ہوئی اور جس میں، میں اپنی پرنسپلی کے زمانہ میں خود بھی رہا ہوں، کتاب کا نسخہ منگایا اور ایک مقام کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا کہ صاحبزادے یہاں سے اسے پڑھو۔ مولانا نے تھوڑی دیر اس کا مطالعہ کیا اس کے بعد اسے سنایا اور اس کا مطلب بیان کر دیا۔ سر ڈینیسن کو بڑا تعجب ہوا اور انہوں نے اس لڑکے کو مستقل طور پر لائبریری کی کتب سے استفادہ کی اجازت دے دی۔ یہ واقعہ میں نے سن رکھا تھا لیکن مجھے اس کی صحت پر یقین نہیں آتا تھا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ مگر اس کے بعد جب میں مدرسہ عالیہ میں پرنسپل تھا تو میرے زمانہ میں نیشنل پبلک لائبریری کی جو کلکتہ کی بڑی مشہور لائبریری ہے اس کی ایک نئی بلڈنگ بنی۔ جس کے افتتاح کے لیے مولانا آزاد وزیر تعلیم حکومت بھارت کی حیثیت سے تشریف لائے تھے۔ مولانا نے تقریر اردو میں کی لیکن ان کا خطبہ انگریزی میں چھپا ہوا تھا اور اس میں اس واقعہ کا مفصل ذکر تھا۔ جس کے بعد اس نسخہ کی تلاش شروع ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ لندن کی لائبریری کو منتقل ہو گیا۔ جب مولانا

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

کے علم میں یہ بات آئی تو ان کی کوشش سے وہ نسخہ وہاں سے واپس حاصل کیا گیا پھر دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن کے زیرِ اہتمام اس کی اشاعت ہوئی اور مولانا ابوالکلام آزاد کا اس پر مقدمہ موجود ہے۔

یہی ایک واقعہ بتاتا ہے کہ مولانا کے اندر عبقریت کتنی اعلیٰ معیار کی تھی۔ وہ اپنی ذہانت وفطانت کے اعتبار سے اپنے ہم عصروں کے اندر بہت ہی ممتاز تھے۔ مولانا آزاد کا اپنے علم وفضل کے لحاظ سے کیا مقام تھا: اس سلسلہ میں دو واقعات آپ کو سناتا ہوں۔ ایک واقعہ تو یہ ہے جو میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔ جس زمانہ میں، میں مدرسہ عالیہ کا پرنسپل تھا اس زمانہ میں مولانا عبدالحلیم صدیقی جو ایک مشہور عالم اور جمعیت العلماء ہند کے ایک مشہور ورکر تھے وہ مدرسہ عالیہ میں محدث تھے جب ان کا تین سال کا کنٹریکٹ ختم ہو گیا تو میں نے ویسٹ بنگال گورنمنٹ کے متعلقہ محکمہ کو لکھا کہ ان کے کنٹریکٹ کی تجدید نہ کی جائے۔ بلکہ ان کو سبکدوش کر دیا جائے تاکہ ان کی جگہ کسی دوسرے توانا اور جواں عالم کا تقرر کیا جا سکے میرا ارادہ تھا کہ میں ان کی جگہ کسی اونچے درجہ کے محدث کو لاؤں گا۔ میری نظر میں اس وقت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی تھے۔ ان ہی دنوں میں مجھے دہلی آنے کا اتفاق ہوا مولانا کو علم ہوا تو انہوں نے مجھے بلا بھیجا۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ پارلیمنٹ کے اجلاس ہو رہے تھے۔ وہیں آنے کے لیے مجھے کہا گیا۔ میں پارلیمنٹ میں ان کے کمرے میں پہنچ گیا۔ مولانا نے مجھے نو بجے صبح کا وقت دیا تھا، اور ٹھیک نو بجے مولانا اپنے کمرے میں تشریف لے آئے۔ مولانا نے پہلے تو میری مزاج پرسی کی۔ مولانا روزے سے تھے۔ موسم ابھی گرم تھا۔ تھوڑی دیر بعد مولانا نے کہا۔ "میرے بھائی" (مولانا کے خطاب کا عموماً انداز یہی ہوتا تھا۔) میں نے آپ کو اس لیے بلایا ہے کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ مولوی عبدالحلیم صدیقی کے کنٹریکٹ کی تجدید کے حق میں نہیں ہیں۔ میں اس کی وجہ آپ سے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ وہ شیخ الحدیث کی جگہ ہے مولانا اب بوڑھے ہو گئے ہیں۔ وہ اس معیار کی اب تعلیم نہیں دے سکتے جس کی ضرورت ہے۔ لہٰذا میں ان کی جگہ ایک دوسرے محدث کو لانا چاہتا ہوں۔ مولانا ادیب ہیں، بہت لائق اور عالم ہیں لیکن فن حدیث میں جس طور پر پڑھانا چاہیئے اس طرح تعلیم اب ان کے بس میں نہیں ہے۔ بس میرا یہ کہنا تھا کہ مولانا آزاد میرے سر ہو گئے اور فرمایا کہ آپ نے یہ کیا کہا کہ فنِ حدیث جس طرح

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

پڑھایا جانا چاہیے اس طرح مولانا عبد الحلیم نہیں پڑھا سکتے۔ میں نے اپنی بساط کے مطابق عرض کیا کہ فن حدیث کو پڑھانے کے لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ پڑھانے والا اسمائے رجال سے خوب واقف ہو۔ طرق اور مسانید پر بھی اس کی گہری نظر ہو۔ درایت اور روایت کے جو اصول ہیں، ان پر بھی اس کی نظر ہو۔ جرح و تعدیل سے بھی وہ بخوبی واقف ہو۔ آپ یقین کیجیے کہ اس پر مولانا نے ڈیڑھ گھنٹے تک مسلسل تقریر کی اور مجھے بتایا کہ فن حدیث دراصل کیا ہے۔ اس کے کتنے اہم شعبے ہیں۔ کتنی شاخیں ہیں۔ ہر شعبہ اور شاخ کی کیا خصوصیات ہیں۔ ان پر اب تک کون کون سی معتبر کتابیں لکھی گئی ہیں۔ فن حدیث کس دور میں اور کس انداز سے ہندوستان میں آیا اور کہاں کہاں اس کی بڑی بڑی درسگاہیں قائم ہوئیں۔ اور فن حدیث کو پڑھانے کی خصوصیات کیا رہیں؟ کون کون سے محدثین اب تک ہندوستان میں ایسے گزرے ہیں جو اس فن میں یکتائے روزگار تھے۔ ہوتے ہوتے وہ اس دور تک آگئے اور فرمانے لگے کہ آج کل پورے ہندوستان میں فن حدیث کی تعلیم و تدریس اس طور پر نہیں ہو رہی جس طور پر فن حدیث کو پڑھانا چاہیے۔ اس دور میں مولانا عبد الحلیم صدیقی اور ان جیسے گنتی کے محدث ہوں گے جو کچھ نہ کچھ اس فن سے تعلق رکھتے ہیں۔ آنے والے علماء تو معیار کے لحاظ سے ان سے بھی گئے گزرے ہوں گے۔ آپ تجربہ کرنا چاہیں تو کرلیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ تجربہ صحیح نہیں ہوگا۔ آخر میں فرمایا میرے بھائی! اب انور شاہ تو آپ کو ملیں گے نہیں۔ وہ فن حدیث کے اساتذہ میں آخری آدمی تھے۔ جو دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اب تو مولانا عبد الحلیم صدیقی ہی کو غنیمت سمجھئے۔ میں رخصت ہونے لگا تو فرمایا، میرے بھائی! میں نے جو کچھ عرض کیا ہے وہ آپ کو یاد رہے گا۔ میں نے ازراہِ شوخی کہا۔ "میں یاد نہ رکھوں گا تو گویا اپنے آپ سے دشمنی کروں گا۔" میری اس بات کو مولانا نے نظر انداز کرتے ہوئے فرمایا "میرے بھائی! اللہ تعالیٰ آپ کو جزا دے"۔ اس جملہ کو تین مرتبہ دہرایا اور تقریباً گیارہ بجے دروازے تک آکر مجھے رخصت کیا۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ پارلیمنٹ جاری ہے۔ اس میں بیٹھے ہیں۔ وزیر تعلیم کی حیثیت سے ان کی مصروفیات بھی بے پناہ ہو گئی تھیں۔ مجھے ذاتی طور پر علم تھا کہ اس دور میں بھی وہ سختی کے ساتھ اپنے دیرینہ معمولات پر کاربند تھے۔ عموماً وہ رات کو نو بجے سو جاتے تھے پھر ڈھائی بجے بیدار ہوتے تھے اور اس وقت وہ اپنا لکھنے پڑھنے

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

کا کام کرتے تھے۔ فجر کی نماز پڑھ کر سو جاتے تھے پھر تقریباً ساڑھے آٹھ بجے اٹھ کر نو بجے دفتر پہنچ جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ وزیر تعلیم کی حیثیت سے مصروفیات کا دائرہ وسیع ہو گیا تھا پھر عمر بھی ضعیفی کی طرف مائل تھی لیکن ان سب کے باوجود استحضارِ علم کا یہ عالم اور یہ حال کہ فن حدیث پر تقریباً مسلسل ڈیڑھ گھنٹے تک انتہائی عالمانہ انداز میں تقریر کی جبکہ سامع صرف اکیلا میں تھا۔

دوسرا یہ واقعہ میرے مشاہدے میں آیا کہ جوش ملیح آبادی اور مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی یہ دونوں مولانا ابوالکلام آزاد سے بہت زیادہ قریب تھے۔ مگر دونوں جس عقیدے اور خیال کے تھے، ان میں سے جوش کو تو آپ سب ہی اچھی طرح جانتے ہیں اور مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی بھی اس زمانہ میں جوش سے اس معاملہ میں کچھ کم نہیں تھے۔ مولانا آزاد نے ایک دن ان دونوں سے کہا کہ میرا آپ سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ آپ میرے پاس آتے جاتے ہیں لیکن میں نے اپنا ایک فرض اب تک ادا نہیں کیا جس کا مجھے بہت افسوس ہے اور میں اس کا سچے دل سے اعتراف کرتا ہوں۔ اب میں چاہتا ہوں کہ آپ حضرات کے سامنے اپنا وہ فرض ادا کر دوں۔ دونوں حضرات نے کہا! وہ کیا ہے؟ فرمایا کہ اللہ کے وجود اور مذہب کی ضرورت اور اسلام کی حقانیت پر آپ دونوں کے سامنے میں ایک تقریر کرنا چاہتا ہوں جو میری طرف سے تبلیغ حق کی ایک کوشش ہوگی۔ آپ حضرات کو حق ہوگا کہ پوری آزادی کے ساتھ میری باتوں پر تنقید کریں، مجھ سے سوالات کریں، مجھ پر جرح کریں، میں پوری خندہ پیشانی سے انہیں سنوں گا اور امکان بھر آپ کے اشکالات کو دور کرنے کی کوشش کروں گا۔ دونوں حضرات نے رضامندی کا اظہار کیا اور کسی آنے والے دن میں صبح نو بجے کا وقت طے ہو گیا۔ مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی نے مدرسہ فتح پوری میں آکر اپنے حلقہ احباب میں اس کا ذکر کیا تو مولانا محمد میاں مرحوم جو مولانا حامد میاں مدظلہ کے والد ماجد ہیں جو آپ کے اسی شہر لاہور میں جامعہ مدنیہ کے مہتمم اور رئیس ہیں اور مولوی قاضی سجاد حسین صاحب جو مدرسہ اسلامیہ فتح پوری دہلی میں اس وقت مدرس تھے اب پرنسپل ہیں۔ ان دونوں کو جب خبر ہوئی تو انہوں نے کہا کہ یہ تو بہت اچھا موقع ہے۔ کیا ہم کو بھی اس مجلس میں شرکت کی اجازت ہوگی! چنانچہ فوراً مولانا آزاد سے ان کے سیکرٹری کے ذریعہ رابطہ قائم کیا۔ مولانا نے فرمایا کہ بڑے شوق سے آپ حضرات بھی تشریف لائیے اور کوئی

© rasailojaraid.com

بھی آنا چاہے تو میری طرف سے اجازت ہے ــــ چنانچہ مولانا محمد میاں مرحوم اور قاضی سجاد حسین صاحب کا یہ بیان ہے کہ ہم بھی پہنچ گئے۔ جوش ملیح آبادی اور مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی بھی وہاں موجود تھے۔ ہم چاروں کے سامنے مولانا آزاد نے تقریر کی۔ مولانا محمد میاں کا یہ بیان ہے کہ مسلسل دو گھنٹے تک انہوں نے تقریر کی۔ اور تقریر کا کمال یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی توحید پر سارے دلائل وہ تھے جو قرآنِ مجید میں ہیں لیکن کہیں قرآن کا حوالہ نہیں دیا کہیں کوئی آیت نہیں پڑھی۔ ان ہی دلائل کو عقلی طور پر اس طرح بیان کیا گویا ان کا قرآن سے کوئی تعلق نہیں ہے حالانکہ تمام قرآنی ہی دلائل تھے ــــ تو اس طرح پر وجودِ باری تعالیٰ، اس کی توحید، مذہب کی ضرورت اور مذاہب میں بھی اسلام کی حقانیت پر مسلسل دو گھنٹے تقریر کی اس کے بعد مولوی عبدالرزاق صاحب نے کہا! مولانا! مجھے تو اب اطمینان ہوگیا۔ میں اللہ سے توبہ کرتا ہوں۔ لیکن جوش ملیح آبادی نے کہا۔ مولانا! میں آپ کے دلائل کا جواب تو نہیں دے سکتا۔ لیکن دل میرا نہیں مانتا، تو مولانا نے کہا کہ میرے بھائی! "دل پر تو میرا کوئی قابو اور اختیار نہیں ہے"۔ جوش نے کہا کہ مولانا! آپ نے Personal God اور Impersonal God کی جو بحث کی ہے تو میں God کو Impersonal تو ماننے کے لیے تیار ہوں Personal نہیں مان سکتا۔ Impersonal کے معنی وہ ہیں جس کو آج کل Energy کہا جاتا ہے۔

مولانا نے فرمایا نہیں وہ God نہیں ہے۔ جو Impersonal ہے، وہ God ہو ہی نہیں سکتا۔ مولانا نے پھر ثابت کیا کہ God وہی ہے جو Personal ہے۔ اس کی ایک ذات اور ہستی ہے پھر اس کو مزید قوی دلائل سے ثابت کیا ــ پس یہ دو واقعات ایسے ہیں، جن سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ مولانا کا علم کتنا مستحضر تھا اور ان کی نگاہ کتنی وسیع تھی۔

مولانا کی شہرت کا آغاز دو چیزوں سے ہوا۔ سب سے پہلے اور سب سے بڑی شہرت کا ذریعہ تو "الہلال" اور "البلاغ" ہوئے۔ اس کے بعد مولانا کی تقاریر ہوئیں۔ مولانا کو اللہ تعالیٰ نے فنِ خطابت کا وہ کمال عطا فرمایا تھا جو نہایت شاذ و نادر ہی کسی کو عنایت ہوتا ہے۔ تقریر سے زیادہ ان کی تحریر نے مسلمانوں میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ تقریریں بھی فن اور اندازِ خطابت ایسا رچا بسا ہوا ہوتا تھا کہ تیر کی طرح دل میں پیوست ہوتا تھا۔ اس کی ایک

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

مؤثر ترین وجہ یہ بھی تھی کہ مولانا نے الہلال اور البلاغ میں اپنی تحریروں کے ذریعہ مسلمانانِ ہند کو ایک نئی راہ دکھائی جس نے دلوں میں ایک نیا جوش اور نیا ولولہ پیدا کیا۔ عام تعلیم یافتہ مسلمانوں کا جو حال ہوا سو ہوا لیکن سب سے اہم بات یہ ہوئی کہ علمائے کرام اور خاص طور پر دارالعلوم دیوبند کے علمائے عظام کا طبقہ اس سے بہت زیادہ متاثر ہوا اور دیوبند کے حلقہ میں سے بھی بالخصوص شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ۔ وہ اس لیے کہ مولانا ابوالکلام آزاد جس چیز کا پیام دیتے تھے اور جو درحقیقت ان کی دعوت کا اصل محور و مرکز تھا وہ سب کچھ وہ تھا جو حضرت شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ کے دل کی آواز تھی اور ان کے اپنے دل کی لگن اور تڑپ تھی۔ چنانچہ حضرت شیخ الہندؒ مولانا آزاد کی دعوت میں اپنے دل کی تمنا، آرزو، خواہش اور امنگ کا عکس دیکھتے تھے۔ اس لیے مولانا آزاد کے سب سے زیادہ قدردان علماء کرام کے حلقہ میں حضرت شیخ الہند تھے۔ حضرت بڑی پابندی سے الہلال اور البلاغ منگایا کرتے اور بڑے ذوق وشوق سے ان کا مطالعہ کرتے تھے۔

جب کانپور میں ایک مسجد حکومت انگلشیہ کے ہاتھوں شہید کی گئی، جس کے ردّعمل میں حکومت کے خلاف ہندوستان کے طول وعرض میں مسلمانوں میں غم وغصہ کا ایک طوفان اٹھا تو حکومت نے آنسو پونچھنے اور اس ہیجان کی شدت کم کرنے کے لیے اس وقت جو یوپی کا گورنر تھا اسے دارالعلوم دیوبند بھیجا۔ مولانا ابوالکلام آزاد اس حادثہ پر نہایت سخت مضامین لکھ چکے تھے۔ جن کو اس جوش وخروش میں بڑا دخل تھا جو مسجد کانپور کو شہید کرنے کے باعث مسلمانوں میں انگریزوں کے خلاف پیدا ہو گیا تھا۔ تو وہ بھی دیوبند پہنچ گئے۔ جب مولانا آزاد اس موقع پر دارالعلوم دیوبند کے دروازے پر پہنچے تو انہوں نے دیکھا گورنر یوپی اندر پہنچ چکے ہیں، وہاں باقاعدہ جلسہ ہو رہا ہے جس میں دیوبند کے تقریباً تمام ہی علمائے کرام موجود ہیں مولانا آزاد نے چاہا کہ وہ اندر جائیں اور جلسہ میں پہنچ کر گورنمنٹ کے اس اقدام پر اپنا احتجاج پیش کریں۔ لیکن وہاں ان کو دروازے پر ہی منتظمین کی ہدایت پر روک دیا گیا اور ان کو بتایا کہ لارڈ صاحب کا حکم ہے کہ آپ کو اندر نہیں آنے دیا جائے لہذا آپ اندر نہیں جا سکتے۔ مولانا آزاد کیا کرتے، دنگا فساد تو ان کے پیش نظر تھا نہیں۔ مجبور ہو گئے۔ اس وقت مولانا کو معلوم ہوا کہ دیوبند کے سارے اساتذہ تو اندر جلسہ گاہ میں موجود ہیں۔ لیکن صرف شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ میں

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

جو منتظمین کے اس عمل سے سخت ناراض ہیں اور اپنے گھر پر ہی مقیم ہیں۔ ادھر حضرت شیخ الہند کو جب معلوم ہوا کہ مولانا آزاد آئے ہیں اور ان کو دارالعلوم کے دروازے پر روک دیا گیا ہے تو حضرت نے فوراً مولانا آزاد کو اپنے پاس بلوالیا۔ دو تین دن مولانا دیوبند میں حضرت شیخ الہند ہی کے ہاں مقیم رہے۔ حضرت شیخ الہند کا مولانا آزاد سے تعلق خاطر کا یہ واقعہ بھی شاہد ہے۔

حضرت شیخ الہند سے بعض ساتھی علماء نے پوچھا "حضرت آپ الہلال اور البلاغ کا اتنا گہرا مطالعہ کرتے ہیں حالانکہ اس میں تصویریں ہوتی ہیں" حضرت شیخ الہند نے جو جواب دیا وہ اس بات کا آئینہ دار ہے کہ حضرت شیخ الہند کس نظر سے مولانا آزاد کو دیکھتے تھے۔ حضرت شیخ الہند نے پہلے تو یہ شعر پڑھا ہے

کامل اس فرقۂ زہاد سے اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

© rasailojaraid.com

پھر فرمایا کہ میاں تم اس بات کو دیکھتے ہو کہ اس میں تصویریں ہوتی ہیں تم یہ بات نہیں دیکھتے کہ وہ فریضۂ جہاد جس سے ہم سب لوگ غافل تھے اس کو سب سے پہلے جس شخص نے یاد دلایا ہے وہ یہی ابوالکلام آزاد ہیں لہٰذا ہم ان کے نہایت شکر گزار ہیں اس لیے میں ان کے پرچوں کو بڑے اشتیاق سے پڑھتا ہوں۔ پھر یہ کہ اس کے بعد میں حضرت شیخ الہند نے جو تحریک شروع کی تھی، تحریکِ آزادی، (تحریکِ ریشمی رومال) اس کا حال آپ حضرات کو معلوم ہوگا تو وہ تحریک ایسی تھی کہ اس میں زیرِ زمین یعنی Under Ground کام ہوتا تھا۔ انگریزی حکومت کے دور میں تو یہ باتیں منظر عام پر آ نہیں سکتی تھیں، لیکن اب اس تحریک کے متعلق تمام حالات شائع ہوگئے ہیں جن سے یہ بات صاف معلوم ہوگئی کہ حضرت شیخ الہند نے انڈر گراؤنڈ کام شروع کردیا تھا جہاں باقاعدہ اسلحہ سازی بھی ہوتی تھی اور باقاعدہ ہتھیار چلانے کی ٹریننگ بھی ہوتی تھی چنانچہ جو لوگ حضرت کے ہم خیال تھے اور ان کے مشن سے تعاون کرتے تھے۔ حضرت نے ان سب سے عہد و پیمان لیا اور وہ سب شیخ الہند کی ہدایت پر خفیہ طور پر اس دعوت اور مشن کے لیے کام کرتے تھے مولانا عبیداللہ سندھی، حضرت شیخ الہند کے سب سے بڑے معاون تھے۔ دوسرے مولانا محمد میاں جو حضرت شیخ الہند کی ہدایت پر کابل چلے گئے وہیں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے صاحبزادے حامد الانصاری غازی ہیں۔ تیسرے مولانا سیف اللہ مرحوم تھے، وہ بھی کابل ہجرت کر گئے

© rasailojaraid.com

تھے۔ پروگرام یہ تھا کہ افغانستان کی حکومت کے تعاون سے ادھر سے انگریز کے خلاف مسلح اقدام کیا جائے۔ یہ تین بزرگ وہ تھے جو حضرت شیخ الہند کے خاص الخاص اور معتمد علیہ لوگ تھے۔ ان ہی قریب ترین حضرات میں چوتھے نمبر پر مولانا ابو الکلام آزاد کا نام شامل تھا۔ مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ اس واقعہ کے بعد جس کا میں کانپور کی مسجد شہید کرنے کے سلسلہ میں ذکر کر چکا ہوں، مولانا دوبارہ بھی کبھی دیوبند تشریف لائے یا نہیں، لیکن اتنا یقین کے ساتھ جانتا ہوں کہ مولانا آزاد سے حضرت شیخ الہند کا رابطہ مسلسل قائم رہا خط و کتابت کے ذریعہ سے یا زبانی لوگوں کی وساطت سے۔ حضرت کی اس تحریک کے ایک اہم رکن مولانا آزاد بھی تھے ان تمام شواہد سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کا شیخ الہند سے بڑا قریبی رابطہ و تعلق تھا۔

مولانا آزاد نے جیسا کہ آپ نے سنا الہلال اور البلاغ کے ذریعہ ایک دعوت دی اس دعوت کو حضرت شیخ الہند دعوتِ جہاد فرمایا کرتے تھے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ صرف دعوتِ جہاد ہی نہیں تھی بلکہ دعوتِ انقلاب تھی۔ مسلمان اپنے جس فرض کو بھول گئے تھے، اس فرض کو مولانا نے یاد دلایا اور اس کے لیے قرآن مجید کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت پر نہایت زور دیا چونکہ مسلمانوں کے پاس اصل قوتِ تسخیر قرآن ہی ہے۔ مولانا نے اس کام کو منظم طور پر کرنے کے لیے ایک جماعت بنائی۔ مولانا نے جو تنظیم بنائی اس کا نام حزب اللہ تھا۔ اس حزب اللہ کے لیے مولانا نے بیعت لی یا نہیں لی، اس کے متعلق میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ البتہ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ مولانا نے جو حزب اللہ بنائی تھی، اس کے لیے مولانا کے پیش نظر یہ ضرور ہوگا کہ وہ اس میں شمولیت کے لیے بیعت لیں۔ بہر حال یہ مولانا کا مشن تھا اس کے لیے انہوں نے کام شروع کیا تھا اور اس راہ میں پیش رفت بھی کی تھی۔ اتنا مجھے معلوم ہے۔

عوام الناس میں ان کی شہرت کی بنیاد اور اساس ان کی قرآن اور جہاد کی دعوت تھی یہی وجہ تھی کہ وہ ہر جگہ انتہائی مقبول ہوئے۔ آپ کے پنجاب میں مولانا بے حد مقبول تھے۔ اس دور کے بڑے بڑے علماء اور دانشور مولانا آزاد کی تحریر، ان کی تقریر اور ان کی دعوت سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ ان کے پیغام نے سوئی ہوئی روحوں کو نہ صرف بیدار کیا بلکہ ان کو ایک ولولۂ تازہ سے سرشار کر دیا اور مولانا پورے برصغیر خاص

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

طور پر پنجاب کے لوگوں کی آنکھوں کا تارا اور ان کے محبوب رہنما بن گئے۔

اس کے بعد جب تحریک خلافت شروع ہوئی تو مولانا نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس مسئلہ پر مولانا کی ملک کے مشہور شہروں میں سے اکثر میں نہایت زوردار اور ولولہ انگیز تقریریں ہوئیں۔ جو صرف خطابت ہی کے لحاظ سے نہیں بلکہ علمی اعتبار سے بھی معرکہ کی تقاریر تھیں۔ آگرہ یعنی اکبر آباد میں خلافت کمیٹی کے زیر اہتمام ایک عظیم جلسہ عام میں مولانا نے 'منصب خلافت' کے موضوع پر نہایت خطیبانہ اور عالمانہ تقریر کی۔ میں خود تو اس جلسہ میں نہیں تھا لیکن مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی مرحوم اور مولانا عتیق الرحمٰن صاحب نیز دوسرے لوگوں سے جو اس جلسہ میں موجود تھے، میں نے سنا کہ 'منصب خلافت' جواب کتابی شکل میں طبع ہو کر موجود ہے یہ پورا کا پورا خطبہ مولانا آزاد نے زبانی دیا تھا۔ اس میں بہ کثرت حوالہ جات تھے جو بالکل صحیح تھے۔ جس سے مولانا آزاد کی ذہانت اور ان کے حافظہ کی پختگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ اس کتاب میں بعد میں بھی مولانا نے کوئی اضافہ اور ترمیم نہیں کی۔ بلکہ یہ کتاب جوں کی توں مولانا کی زبانی تقریر پر مشتمل ہے۔ مولانا آزاد نے اس نوع کی جگہ جگہ تقریریں کیں، اور لوگوں کو تعجب ہوتا تھا کہ مولانا کا دماغ تو پورا ایک کتب خانہ معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ شاید ہی مولانا کی کوئی تقریر ایسی ہوتی ہو جس میں مولانا سلف کی کسی نہ کسی معروف علمی شخصیت کی تحریروں کا باقاعدہ حوالہ نہ دیتے ہوں، یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ مولانا کا حافظہ اور ان کا مطالعہ کس قدر مضبوط اور وسیع تھا۔

مولانا آزاد کی علمیت کا ذکر زبان پر آیا تو مجھے یہ بات یاد آئی کہ کچھ لوگ کہا کرتے تھے۔ اور شاید اب بھی ایسا کہنے اور سمجھنے والے کچھ لوگ موجود ہوں کہ مولانا آزاد ذہین بہت زیادہ ہیں لیکن ان کا علم بہت کم ہے۔ لیکن میں آپ کو بتاتا ہوں کہ مولانا کے انتقال کے بعد ایسی ٹھوس شہادتیں مل گئی ہیں جن سے لوگوں کا یہ قول غلط ثابت ہو جاتا ہے ہمارے یہاں نئی دہلی میں حکومت کا قائم کردہ ایک محکمہ ہے۔ جس کا نام انڈین کلچر اینڈ سائنس ریسرچ انسٹیٹیوٹ یا اسی سے ملتا جلتا نام ہے اس کی ایک بہت بڑی لائبریری ہے اس میں مولانا آزاد کا ذاتی کتب خانہ منتقل ہو گیا ہے جو بے شمار قیمتی کتابوں پر مشتمل تھا اور اس میں بعض نادر کتب کے نسخے بھی شامل تھے۔ اس لائبریری میں جب مولانا آزاد کی کتابوں کا جائزہ لیا گیا تو یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ بہت کم کتابیں مولانا آزاد کے

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

کتب خانہ کی ایسی تھیں جن پر مولانا کے نوٹ اور حواشی نہ ہوں۔ اس کے برعکس ان کتابوں کی تعداد بہت زیادہ تھی جن پر مولانا نے نوٹ اور حواشی تحریر کیے تھے۔ چنانچہ حکومت نے ایک شخص کو اس کام کے لیے مقرر کیا کہ وہ مولانا کے جن کتابوں پر حواشی ہیں ان سب کو مرتب کر کے پیش کرے۔ چنانچہ تمام حواشی مرتب ہو کر پیش ہوئے اور رسالہ جامعہ دہلی میں وہ قسط وار چھپ گئے ہیں۔ ان حواشی سے مولانا کی دقتِ نظر اور گہرے غور و فکر کا اندازہ ہوتا ہے۔ الغرض مولانا آزاد کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ ان کا حافظہ بھی نہایت قوی تھا، ساتھ ہی انتہائی ذہین و فطین تھے۔

مولانا آزاد کی سیاسی زندگی میں اغلباً ۲۶ء سے یہ موڑ آیا کہ مولانا نے جمعیت علماء ہند کے کاموں سے وہ عملی دلچسپی لینی چھوڑ دی جو وہ پہلے مسلسل لیتے رہے تھے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس دور سے مولانا کی تقریباً تمام تر عملی دلچسپیاں کانگریس کے لیے وقف ہو گئی تھیں۔ جمعیت علماء ہند کے سالانہ جلسوں میں وہ اکثر تشریف لاتے تھے تقریر بھی کرتے تھے۔ یہ ایک الگ بات ہے۔ لیکن یہ میرے ذاتی مشاہدہ کی بات ہے کہ باوجود اس کے کہ وہ جمعیت کی ورکنگ کمیٹی کے تقریباً ہر دور میں ممبر رہے اور وہ اس کے اجلاسوں میں تشریف بھی لاتے تھے لیکن جمعیت کے ساتھ ان کی پہلے جو عملی وابستگی تھی، اور اس کے کاموں میں جو سرگرمی تھی، وہ تقریباً ختم ہو چکی تھی اور ان کی عملی سرگرمیوں کا میدان کانگریس تھی۔ اب ایسا کیوں ہوا؟ مجھے اس کی تحقیق کا موقع نہیں ملا۔ لیکن میں اس معاملہ میں بطور قیاس یہ سمجھتا ہوں کہ ہو سکتا ہے کہ مولانا آزاد کو یہ محسوس ہوا ہو کہ ہماری رجوع الی القرآن اور جہاد فی سبیل اللہ کی دعوت ناکام ہو گئی ہے یا یہ کہ دعوت نے اتنی تیز رفتاری سے لوگوں کے اذہان و قلوب کو مسخر نہیں کیا کہ وہ اس کے لیے اس ایثار و قربانی کے لیے آگے آسکیں۔ جو اس دعوت کے لیے ضروری ہے۔ پھر ترکی میں خلافت کا ادارہ خود مصطفےٰ کمال نے ختم کر دیا اس طرح مسلمانوں کے جوش عمل پر مایوسی اور سرد مہری طاری ہو گئی۔ لہٰذا انہوں نے سوچا کہ اب تحریک کو دوبارہ زندہ اور متحرک و فعال بنانے کا امکان تو نظر آتا نہیں۔ اس لیے اب سب سے پہلے انگریز کی حکومت کا ہندوستان سے خاتمہ کی طرف زیادہ توجہ ہونی چاہئے چونکہ نہ صرف ہمارے ہی راستہ کی سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے بلکہ پورے

© rasailojaraid.com

عالم اسلام کو اسی انگریزی حکومت کے ہاتھوں سے بالواسطہ اور بلاواسطہ سخت نقصان پہنچ رہا ہے۔ عالم اسلام کی بھلائی کے لیے بھی انگریزی حکومت کا ہندوستان سے خاتمہ نہایت ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ استخلاصِ وطن کے لیے ملک کی عظیم غیر مسلم اکثریت کی حمایت ضروری تھی اور چونکہ انڈین نیشنل کانگریس ایک غیر فرقہ وارانہ جماعت تھی، لہذا انہوں نے سوچا ہوگا کہ پہلے متحدہ قوت سے انگریزی حکومت پر ضرب کاری لگائی جائے۔ میری رائے یہ ہے کہ انہوں نے ان خطوط پر سوچا ہوگا۔ اور برادران وابنائے وطن کے ساتھ ایک مشترکہ پلیٹ فارم سے اس حکومت کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کے لیے اپنی توجہات اور مساعی کو مرتکز کر دیا ہوگا۔

مولانا ابوالکلام آزاد ایک زمانہ میں بہت بڑے انقلابی تھے، جنہوں نے ان کی زندگی کے حالات پڑھے ہیں ان کو علم ہوگا کہ مولانا نے خود اعتراف کیا ہے کہ ایک زمانہ میں ملک میں جو انقلاب پسند تھے جن کو انتہا پسند (Extremist) یا جن کو دہشت پسند (Terrorist) کہا جاتا ہے۔ مولانا آزاد کا ان سے بھی کچھ عرصہ تعلق رہا ہے۔ مولانا جلد ہی ان سے الگ ہوگئے۔ چونکہ انہوں نے علی وجہ البصیرت اس طریقہ کو صحیح نہیں سمجھا اور انہوں نے کانگریس کے ساتھ استخلاصِ وطن کے لیے تعاون کیا لیکن کانگریس میں اعلیٰ مقام پر فائز رہنے کے باوجود تین باتیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں اور یقینی ہیں۔ ایک یہ کہ مولانا نے اپنی وضع وقطع کو کبھی نہیں بدلا۔ کانگریس میں ہمیشہ اسی وضع کے ساتھ رہے۔ اور دوسرے یہ کہ مسلمانوں کے حقوق اور اسلام کے مفادات کو انہوں نے قربان کرنا تو درکنار کبھی نظر انداز بھی نہیں کیا۔ ان امور کے لیے وہ برابر مساعی اور جدوجہد کرتے رہے۔ تیسرے یہ کہ قرآن مجید کا جو انقلابی فکر ہے اس کو اجاگر اور مہمیز کرنے والا تحقیقی حواشی کے ساتھ اس کا ترجمہ ان کے پیشِ نظر تھا، اس پر بھی وہ برابر کام کرتے رہے۔ اس کا قدرے تفصیلی ذکر میں آگے کروں گا۔

یہ بات کون نہیں جانتا کہ مولانا آزاد کو تحریک اور نظریہ پاکستان سے اختلاف تھا۔ لیکن میں اپنی ذاتی اور عینی شہادت کی بنا پر کہتا ہوں کہ ملک کی تقسیم اور آزادی کے بعد اکتوبر ۱۹۴۷ء میں مولانا آزاد نے لنچ کے لیے چند سربرآوردہ مسلمان رہنماؤں کو مدعو کیا۔ میں تو ان سب سے چھوٹا تھا اور ان حضرات کرام کے ساتھ نتھی ہوتا تھا۔ ان

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

حضرات میں قابلِ ذکر حضرات ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سوہاروی ہیں۔ اور بھی چند اکابر اس لنچ میں شریک ہوئے جن کے نام اس وقت ذہن میں مستحضر نہیں ہیں بہرحال میں بھی مدعوین میں شامل تھا۔ لنچ سے فارغ ہونے کے بعد مولانا آزاد نے فرمایا کہ میں نے آپ حضرات کو اس لیے بلایا ہے کہ میں آپ حضرات سے چند خاص باتیں کرنی چاہتا ہوں۔ سب نے کہا ضرور ارشاد فرمایئے۔ مولانا نے فرمایا کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمارا نظریہ پاکستان سے اختلاف تھا، وہ اپنی جگہ تھا۔ اس کے لیے ہمارے پاس ٹھوس وجوہ اور قوی دلائل تھے۔ لیکن اب جبکہ ملک تقسیم ہو گیا ہے اور پاکستان وجود میں آ گیا ہے تو ہم کو پاکستان کے کسی لیڈر یا کسی شخص کے متعلق اپنے دل میں کوئی رنجش اور کدورت نہیں رکھنی چاہیئے۔ میرے بھائی! وقت کی ایک سیاست تھی۔ جس سیاست کو کامیاب ہونا تھا وہ ہو گئی۔ اس کے بعد پھر فرمایا، دوسری بات یہ کہ اب پاکستان کے لیے کسی طرح کی بدخواہی کرنا یا اس کے لیے کسی طرح کی بداندیشی کرنا نہ صرف ہمارے ملک ہندوستان کے لیے مضر ہے بلکہ خاص طور پر ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کے لیے بھی انتہائی مضر، مہلک اور خطرناک ہے اس واسطے کہ اگر پاکستان بھی ختم ہو گیا یا پاکستان پر کوئی زوال آیا تو پھر ہندوستان کے مسلمان منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہیں گے اور پھر اس پر مستزاد یہ کہ برصغیر میں مسلمانوں کا مستقبل انتہائی تاریک ہو جائے گا۔ ان کے لیے یہاں کوئی گنجائش نہیں ہو گی۔ مولانا نے صاف لفظوں میں کہا کہ اب پاکستان کے ساتھ ہمارا بالکل دوسرا رویہ ہونا چاہیئے اور ہم سب کو دعا کرنی چاہیئے اور تمنا کرنی چاہیئے کہ پاکستان پھلے پھولے اور مستحکم ہو۔ سیاسی اعتبار سے ہماری حکومت بھی کہتی ہے کہ ہندوستان اور پاکستان ایک (Region) ایک ہی خطہ کے دو ملک ہیں اس (Region) کی سلامتی اور خوشحالی اسی پر موقوف ہے کہ دونوں ملک اچھے پڑوسیوں کی طرح مل جل کر رہیں اور دونوں ملکوں میں خیر سگالی اور خیر اندیشی کے جذبات پروان چڑھیں۔ بھارت کی حکومت کی طرف سے تو یہ ایک سیاسی بات بھی ہو سکتی تھی۔ لیکن میں مولانا آزاد کے متعلق آپ کو بتاتا ہوں کہ وہ تنہائیوں میں ہم سے بڑی شدت اور خلوص کے ساتھ یہ کہا کرتے تھے کہ

© rasailojaraid.com

اب پاکستان سے کوئی اختلاف ہمیں نہیں ہونا چاہیئے جہاں تک ہندوستان کے مسلمانوں کا تعلق ہے، تو ان کے متعلق مولانا برملا کہا کرتے تھے کہ ہماری زندگی کے دو حصّے ہیں ایک دینی اور ثقافتی زندگی اور ایک ہے ہماری قومی اور سیاسی زندگی۔ تو جہاں تک ہماری دینی اور ثقافتی زندگی کا تعلق ہے، مَیں صاف لفظوں میں آپ سے کہتا ہوں کہ اس میں کوئی Compromise نہیں ہو سکتا۔ اس موقعہ پر مولانا بے ساختہ ہاتھوں کو جھٹک دیا کرتے تھے۔ اور تکرار کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ ہم اپنے دین پر قائم رہیں گے۔ اپنی ثقافت پر قائم رہیں گے۔ اس معاملہ میں ہم کسی کے ساتھ کسی نوع کا بھی سمجھوتہ نہیں کریں گے لیکن جہاں تک سیاست کا تعلق ہے مولانا نے کہا کہ مَیں نے پہلے بھی کہا اور اب بھی کہتا ہوں کہ جس ملک میں مسلمان اقلیت میں ہوں وہاں الگ سیاست کا میدان بنانا ان کے حق میں مفید نہیں ہو گا لہٰذا فرقہ وارانہ سیاست کو چھوڑ کر آپ لوگ اب ملکی سیاست میں بھرپور حصّہ لیں۔ مولانا کو جب بھی موقعہ ملتا وہ مسلمان لیڈروں کو اسی کی تاکیدی نصیحت کیا کرتے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد کبھی بھی مولانا کی زبان سے نہ جلوت میں نہ خلوت میں کوئی بدخواہی کی بات نہیں نکلی بلکہ وہ برملا کہا کرتے تھے کہ اب پاکستان کو لازماً باقی رہنا چاہیئے۔ اسے مضبوط اور خوشحال ہونا چاہیئے یہی بات اس کے لیے اور ہندوستانی مسلمانوں کے لیے مفید اور بہتر ہے۔

مولانا آزاد کے متعلق مَیں عینی شاہد اور ذاتی معلومات کی بنا پر آپ کو بتاتا ہوں کہ دو چیزیں ان کے اندر نہایت ہی لاجواب تھیں پہلی یہ کہ اپنے مخالف کو کبھی برا بھلا کہنا وہ جانتے ہی نہیں تھے۔ مولانا کے متعلق لوگوں نے کیا کچھ نہیں کہا ان کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا گیا لیکن مَیں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایک مرتبہ بھی کبھی مَیں نے مولانا کی زبان سے قائداعظم یا لیاقت علی خان یا مسلم لیگ کے کسی دوسرے لیڈر یا خود مسلم لیگ کے متعلق بدگوئی سنی ہی نہیں۔ ان میں اس قدر وسعت ظرف تھی کہ کبھی کسی کی برائی نہیں کرتے تھے کبھی غیبت نہیں کرتے تھے۔ دوسری بات یہ کہ ان کے اندر خودداری نہایت اعلیٰ درجہ کی تھی۔ اس کا ایک واقعہ مَیں آپ کو بتلاؤں۔ قرآن مجید کے ترجمہ کی "ترجمان قرآن" کے نام سے جو پہلی جلد شائع ہوئی تھی تو اس کے کاتب تھے مولانا عبدالقیوم۔ بعد میں وہ ہمارے رسالہ برہان سے وابستہ ہو گئے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ مولانا کا بالی گنج میں جو مکان

© rasailojaraid.com

تھا وہیں انہوں نے مولانا عبدالقیوم کو کتابت کے دوران رہنے کے لیے بلا لیا تھا۔ جہاں وہ نو دس مہینے مقیم رہے۔ ان نو دس مہینوں کے قیام میں مولانا عبدالقیوم جو مشاہدات بیان کرتے ہیں، وہ بڑے عجیب و غریب ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مولانا کی بالی گنج میں جو دو منزلہ کوٹھی تھی، میں نے بھی اسے دیکھا ہے۔ تو جب مولانا پر افلاس اور فقر و فاقہ کا دور آیا تو مولانا آزاد نے اس کا اوپر کا حصہ کرایہ پر دے دیا یا نیچے کا۔ یہ مجھے اس وقت یاد نہیں۔ بہرحال کوٹھی کا ایک حصہ کرایہ پر دے دیا اور ایک حصہ میں خود رہائش رکھی۔ مولانا عبدالقیوم بتاتے تھے کہ ہم نے کئی بار دیکھا کہ دوپہر کو کھانے کا وقت ہو گیا اور مولانا کے گھر میں چولھا نہیں جلا۔ معلوم ہوا کہ مولانا کے گھر کھانا نہیں پکا۔ ایسے حالات میں مولانا اپنے ذاتی ملازم کو [illegible] سے چونی دیتے اور اس سے بازار سے سالن روٹی منگاتے اور مولانا اور ان کی اہلیہ اسی میں گزارا کر لیتے۔ یہ وقت بھی مولانا پر گزرا ہے۔

ایک دن پنڈت جواہر لال نہرو اور گاندھی جی مولانا آزاد کی کوٹھی پر ان سے ملنے کے لیے آئے تو مولانا آزاد اس وقت کھدر کا جو کرتہ پہنے ہوئے تھے وہ مونڈھے کے اوپر سے پھٹا ہوا تھا تو اسی کرتے کو پہنے ہوئے مولانا ان حضرات سے ملے۔ مگر انہوں نے مونڈھے پر ایک چادر ڈال لی۔ ان حضرات نے مولانا سے کہا کہ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آج کل آپ مالی مشکلات سے دوچار ہیں، اس ضمن میں ہم آپ کے ساتھ تعاون کرنا چاہتے ہیں۔ مولانا نے جواب دیا کہ مجھے کسی تعاون کی ضرورت نہیں ہے اور ان حضرات کے اصرار کے باوجود مولانا نے کوئی امداد قبول نہیں کی ـــــ مولانا خیرالدین مرحوم، جو مولانا آزاد کے والد ماجد تھے کلکتہ میں میمن اور دہلی اور یوپی کے تاجر حضرات کی، جو کلکتہ میں تجارت کرتے تھے، ان کی بہت بڑی تعداد ان کی مرید تھی۔ مولانا آزاد کے والد کے انتقال کے بعد ان کے مختلف وفود نے مولانا آزاد سے اصرار کیا کہ آپ اپنے والد مرحوم کی گدی سنبھال لیں ہم آپ کی وہی تعظیم و تکریم اور خدمت کریں گے جو آپ کے والد بزرگوار کی کیا کرتے تھے۔ مولانا آزاد نے صاف کہہ دیا کہ وہ راہ میرے والد کی راہ تھی میں اس راہ کا آدمی نہیں ہوں۔ میں اس نوع کا کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتا۔ انہوں نے کہا کہ ہم تو آپ کی خدمت میں وعظ و نصیحت کے کچھ کلمات سننے کے لیے آنا چاہتے ہیں تو مولانا نے کہا کہ اس مقصد کے لیے میں ہفتہ میں دو دن پیر اور جمعرات آپ کو دیتا ہوں۔

© rasailojaraid.com

عصر سے کر مغرب تک آپ لوگ تشریف لا سکتے ہیں مگر ساتھ ہی تاکید کی کہ میں کسی قسم کا کوئی نذرانہ، کسی قسم کا کوئی عطیہ آپ حضرات سے قبول نہیں کروں گا۔ الغرض ان کی بے نیازی اور ان کی خودداری کا یہ عالم تھا کہ خود تکلیف اٹھاتے تھے لیکن کسی سے نذرانہ یا عطیہ قبول نہیں کرتے تھے، یہ ان کا مستقل مزاج تھا ——— پھر ان کے اخلاق کا یہ عالم تھا کہ میں بارہ چودہ سال تک بارہا ان کی نجی صحبتوں میں شریک رہا ہوں لیکن میں نے کبھی کسی کے متعلق ان کی زبان سے کوئی برا کلمہ یا شکوہ و شکایت کا جملہ نہیں سنا۔ آپ میں سے اکثر حضرات نے وہ واقعہ سنا ہوگا کہ جب تحریکِ پاکستان کا بہت زور تھا اور یہ تحریک اپنے شباب پر تھی تو اس زمانے میں مولانا ابوالکلام آزاد دہلی سے الہ آباد جا رہے تھے جب ان کی گاڑی علی گڑھ کے اسٹیشن پر پہنچی تو علی گڑھ یونیورسٹی کے چند طلبا نے مولانا کے ساتھ گستاخی کا معاملہ کیا اور مولانا کے ساتھ نہایت نازیبا حرکات کیں۔ پنڈت سندر لال کا بیان ہے کہ ہم نے جب دوسرے دن اخبارات میں پڑھا کہ علی گڑھ اسٹیشن پر مولانا آزاد کے اوپر ریک حملہ ہوا اور ان کے ساتھ اہانت آمیز حرکات کی گئی ہیں تو میں فوراً الہ آباد پہنچا تاکہ میں مولانا سے اس واقعہ پر اظہارِ افسوس کروں اور ان کی دلجوئی کروں۔ پنڈت جی کا بیان ہے کہ میں نے جاتے ہی کہا مولانا! بڑے افسوس کی بات ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی کے طلبہ نے آپ کے ساتھ یہ حرکت کی۔ مولانا بجائے غصہ کے کچھ مسکرائے اور اسی حالت میں کہا کہ پنڈت جی کیا کیا جائے۔ اپنی ہی اولاد ہے، اپنے ہی بچے ہیں۔ شرارت کے کیا ہی ہوتے ہیں وہ ہوگئی شرارت۔ اب اس پر افسوس سے کیا حاصل، ہم کو کام تو ان ہی سے لینا ہے۔ الغرض مولانا نے اس پر اپنے کسی غم و غصہ کا کوئی اظہار نہیں کیا۔ کوئی ناگواری ان کے اوپر طاری نہیں تھی۔ اور وہ اس افسوسناک واقعہ کو بھی پی گئے اور ٹال گئے تھے ——— تو یہ تھے مولانا ابوالکلام آزاد اپنے کیریکٹر کے اعتبار سے اور اپنے اخلاق کے اعتبار سے۔

اب میں مولانا آزاد کے ان اہم کاموں کے متعلق کچھ عرض کرتا ہوں جو آزادی کے بعد مولانا نے ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کے لیے انجام دیے تھے ہندوستان میں مسلمانوں کے جو ثقافتی مراکز تھے مولانا نے ان کو محفوظ رکھنے اور ان کو ترقی دینے کی بڑی کوشش کی چنانچہ دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن جو عربی کے نادر

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

ملفوظات کی اشاعت کا ایک نامور ادارہ ہے اسے مولانا مرحوم نے قائم رکھا اور نہ صرف قائم رکھا بلکہ اس زمانہ میں اس کی ساٹھ ہزار روپے ماہوار گرانٹ مقرر کرادی۔ اللہ کا شکر ہے کہ وہ ادارہ تقسیم سے پہلے جس طرح جاری تھا اس سے کہیں ترقی کے ساتھ وہ اب بھی جاری ہے۔ اسی طرح ریاست رام پور کا شاندار کتب خانہ جس کا نام رضا لائبریری ہے، اس کے متعلق عام خیال یہ تھا کہ تقسیم کے بعد یہ اجڑ جائے گا۔ مولانا آزاد نے اس کو باقاعدہ حکومت کی تحویل میں لے لیا اور اسے یوپی گورنمنٹ کی نگرانی میں دے دیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ یہ لائبریری ترقی کر رہی ہے اور اس کا لاکھوں روپے کا سالانہ بجٹ یوپی کی حکومت پورا کر رہی ہے۔ اسی طرح پٹنہ کی مشہور عالم خدا بخش لائبریری کو بھی مولانا کی کوششوں سے حکومت کی طرف سے تمام حفاظتی انتظامات مہیا کیے گئے اور اس کے لیے بھی مولانا نے لاکھوں روپے کے سالانہ بجٹ کی منظوری حاصل کی۔ یہ ادارہ بھی نہ صرف باقی ہے بلکہ ترقی پذیر ہے۔ اسی طرح علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا معاملہ ہے، اس کو بچانے میں مولانا آزاد کا بہت بڑا حصہ ہے۔ وہاں مولانا نے آزادی کے بعد اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کیا۔ عربی کے شعبہ کو کافی ترقی دی۔ اسلامیات کے شعبہ کو وسیع تر کیا۔ اور آج اگر آپ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو دیکھیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ وہ ہندوستان یعنی بھارت ہی کی نہیں بلکہ ایشیا کی ان عظیم الشان یونیورسٹیوں میں سے ہے جن پر مسلمان بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ اس کی ترقی میں بہت بڑا دخل مولانا ابوالکلام آزاد کا ہے۔ کم و بیش یہی صورت حال جامعہ ملیہ دہلی کی ہے اور بھارت کی ایک مثالی یونیورسٹی کا مقام حاصل کر چکی ہے۔ مزید براں کئی دینی مدرسے اور ثقافتی مراکز مولانا کی کوششوں سے شرارت پسندوں کی دست برد سے محفوظ رہے۔ الغرض مولانا ابوالکلام آزاد نے آزادی کے بعد نہایت نامساعد حالات میں بھارت میں مسلمانوں اور اسلام کی خدمت بڑی جرأت، دلیری، ہمت اور بہادری کے ساتھ کی ہے۔

علمی طور پر مولانا کے بہت عظیم الشان کارنامے ہیں، لیکن ان کا سب سے بڑا اور عظیم ترین کارنامہ ہے "ترجمان القرآن" جو مولانا کی تفسیر ہے۔ اس کو تفسیر کے بجائے ترجمہ اور اس پر مفصل حواشی کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت وہ ہے جس کے متعلق مولانا آزاد نے خود اس کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ اب تک جتنے

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

بھی تراجم کیے جا چکے اور تفاسیر لکھی جا چکی ہیں، یہ کام اب تک کسی نہ کسی خاص نقطہ نظر کے تحت کیا جاتا رہا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ تفسیر کے جتنے بھی ادوار ہیں، ان میں پہلا دور ہے تفسیر ماثور کا۔ تفسیر ماثور کے معنی ہیں وتفسیر قرآن احادیث کے ذریعہ سے، جیسا کہ ابن جریر طبری کی تفسیر ہے۔ یہ ایک اہم چیز ہے اس میں کوئی شبہ نہیں ہے لیکن اس میں سب سے بڑا نقص یہ ہے جس کی طرف امام احمد ابن حنبل رحمتہ اللہ علیہ نے بھی اشارہ کیا ہے، کہ اس کے اندر درج شدہ روایتوں کی جانچ پرکھ میں وہ احتیاط اور سختی نہیں برتی جاتی جو برتنی چاہیے امام احمد ابن حنبل نے فرمایا کہ تین چیزیں ایسی ہیں جن کے پیش نظر احادیث کو نہایت احتیاط سے قبول کرنا چاہیئے ایک ملاحم، دوسری مغازی اور تیسری تفسیری روایات۔ امام موصوف نے فرمایا کہ ایسی احادیث جرح وتعدیل اور جانچ پرکھ کے بغیر تفسیر میں داخل کر دی جاتی ہیں جن کی وجہ سے قرآن مجید کے مطالب اور مقصود میں انتشار و اختلال پیدا ہو جاتا ہے دوسری بات میں عرض کروں، وہ یہ کہ ضعیف روایات کے علاوہ تفسیر ماثور میں اسرائیلیات نے بہت راہ پالی ہے۔ اسرائیلیات وہ روایتیں ہیں جو قدیم محرف کتب سماویہ کے مطابق ایک طبقہ نے عام طور پر مسلمانوں میں پھیلا دی ہیں۔ ان پر ہمارے قدیم وجدید علماء نے بڑی تفصیل سے بحثیں کی ہیں۔ ان اسرائیلیات کا نہایت ہی قلیل حصہ ایسا ہے جس کے متعلق علماء یہ کہتے ہیں کہ ان کو درج کیا جا سکتا ہے چونکہ وہ ہماری کسی منصوص اور صحیح روایت سے معارض نہیں ہیں۔ لیکن ان اسرائیلیات کا بہت بڑا حصہ وہ ہے جو قابل رد ہے، اور جو درحقیقت قرآن مجید کے اوپر ایک نوع کی تعدی اور زیادتی کا حامل ہے مثلاً ہاروت وماروت کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ ان کے بارے میں اسرائیلیات کی ایک عام روایت ہے جس کے متعلق نہایت افسوس کے ساتھ عرض کرتا ہوں، کہ ہمارے شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ جو کہ بہت بڑے محدث ہیں، یقیناً ان کا مقام بہت بلند ہے، ان کی جو تفسیر عزیزی ہے اس میں انہوں نے اس کو نقل کر دیا ہے۔ وہ روایت یہ ہے کہ ہاروت وماروت دو فرشتے تھے جو زمین پر دو عورتوں پر عاشق ہو گئے جن کا نام تھا زہرہ اور مشتری۔ وہ جانتی تھیں کہ ان دونوں فرشتوں کے پاس اسم اعظم ہے۔ تو انہوں نے ان سے کہا کہ ہم تم کو اس وقت اپنے قرب اور وصل سے شاد کریں گی جب تم اسم اعظم ہمیں سکھلا دو۔ پس انہوں نے اسم اعظم ان کو سکھلا دیا نتیجہ یہ ہوا کہ

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

وہ عورتیں آسمان پر چلی گئیں ایک زہرہ ستارہ اور دوسری مشتری ستارہ بن گئی اور بے ہاروت وماروت تو ان کو ایک اندھیرے کوئیں میں الٹا لٹکا دیا گیا۔ حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح کوئی شخص ان کو سن سکتا اور برداشت کر سکتا ہے۔ ایک نہیں بے شمار اسرائیلیات ہیں جن کو عقل عام بھی سننا گوارا نہیں کرتی چہ جائیکہ ان کو تفسیری روایات کے طور پر جگہ دی جائے۔ حضرت داؤدؑ کے متعلق حضرت سلیمان کے متعلق، جنت و دوزخ سے متعلق، حضرت آدم کے جنت سے نکلنے کے متعلق وغیرہ وغیرہ اس قسم کی روایتیں ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی سمجھدار آدمی کیسے گوارا کر سکتا ہے کہ اس قسم کی روایات تفسیر میں لائے مگر یہ ہوا۔ اور اکثر تفسیر ماثور کا یہی حال ہے ـــ اس کے بعد جب علم کلام کے مختلف مذاہب بنے یا فقہ کے مذاہب وجود میں آئے تو ان کے بعد جو تفاسیر لکھی گئی ہیں۔ اگر کسی ماتریدی نے لکھی ہے تو اس نے اپنے عقیدے کے مطابق لکھی ہے اگر کوئی اشعری ہے تو اس نے اپنے عقائد کے مطابق لکھی ہے۔ اگر کسی حنفی نے لکھی ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ سارا قرآن شریف امام ابو حنیفہ کے مذہب پر نازل ہوا تھا۔ یہی حال دوسرے فقہی مسالک کے مفسرین کا نظر آتا ہے الا ماشاء اللہ۔ اور یہ سلسلہ سلف سے لے کر اب تک جاری ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید ان سب چیزوں سے بلند ہے۔ قرآن کی تفسیر تو اس طرح لکھی جانی چاہیئے اور اس طرح سامنے آنی چاہیئے کہ یہ معلوم نہ ہو کہ یہ کسی خاص علم کلام یا کسی خاص فقہی مکتب فکر کا پابند ہے۔ امام رازی کی تفسیر میں منطق اور فلسفہ کا ... کہ ان کی تفسیر کے متعلق یہ قول مشہور ہو گیا ہے کہ تفسیر کبیر میں سب کچھ ہے سوائے قرآن کے۔ مولانا آزاد نے اس صورت حال کا اپنے مقدمہ میں ذکر کیا ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے اکثر علماء منطق اور فلسفہ سے بڑی دلچسپی رکھتے ہیں فقہ سے بڑا شغف رکھتے ہیں۔ حدیث سے بھی دلچسپی موجود ہے لیکن اگر دلچسپی نہیں ہے تو قرآن کے معارف، اس کے عرفان، اس کی جاودان انقلابی دعوت اس کے حقیقی پیغام کی طرف التفات کم ہے الا ماشاء اللہ۔ مولانا آزاد نے ترجمان القرآن میں اس بات کی رعایت ملحوظ رکھی کہ قرآن جو بات جس طرح جس مقام پہ کہنا چاہتا ہے اسی طرح مسلمانوں کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ اس سے بعض غلط فہمیاں بھی پیدا ہوئیں۔ مثلاً سورۂ بقرہ میں جہاں وہ آیت ہے اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِئِیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ○ اس پر بڑا ہنگامہ ہوا اور غلام احمد پرویز صاحب نے طلوع اسلام کے ذریعہ اس کو خوب اچھالا چونکہ مولانا نے اس آیت کا لفظ بہ لفظ ترجمہ کر دیا تھا۔ بات صرف اتنی تھی کہ اگر مولانا آزاد اس کے حاشیہ میں یہ لکھ دیتے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے بعد ایمان کا مفہوم بالکل متعین ہو گیا ہے اور اب اس کا مفہوم یہ ہے۔ نجاتِ اخروی کے لیے اب آں حضور پر ایمان لانا لازم، لابد اور ناگزیر ہے۔ قرآن میں اکثر جہاں بھی ایمان لانے کی دعوت ملے گی وہاں عموماً ایمان کی تفاصیل نہیں ملیں گی۔ اٰمِنُوْا، میں ان تمام امور پر ایمان لانا ضروری ہوگا جن پر جگہ جگہ قرآن ایمان لانے کی مختلف اسالیب سے دعوت دیتا ہے۔ لہٰذا ایمان کی تعریف ہی یہ قرار پاتی ہے کہ اللہ پر ایمان اس کی توحید کے ساتھ اس کی صفات کمال پر ایمان، یومِ آخرت پر ایمان، جزا و سزا پر ایمان، جنت و دوزخ پر ایمان، فرشتوں پر ایمان، وحی پر ایمان، کتابوں پر ایمان، نبوت و رسالت پر ایمان اور اس پر ایمان کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی اور آخری رسول ہیں اور قیامت تک آپ ہی کی دعوت رسالت کا دور جاری و ساری رہے گا۔ میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ مولانا آزاد ان تمام باتوں کو مانتے تھے۔ لوگوں نے مولانا سے پوچھا تو مولانا نے جواب دیا کہ میرا عقیدہ وہی ہے جو تمام مسلمانوں کا ہے اور وہ عقیدہ یہ ہے کہ حضورؐ کی بعثت اور قرآن کے نزول کے بعد اب نجاتِ اخروی کا دار و مدار صرف حضورؐ کا اتباع اور آپؐ کی اطاعت اور قرآن کی پیروی پر ہے۔ آپ سے پہلے کے رسولوں پر ایمان اور سابقہ کتب سماوی پر ایمان اور ان کے مطابق عمل سے اب نجاتِ اخروی نہیں ہوگی۔ پھر مولانا سے سوال کیا گیا کہ آپ نے یہاں یہ بات لکھی کیوں نہیں! تو مولانا نے جواب دیا کہ اس مقام پر آیت میں جو بات فرمائی گئی ہے میں نے اتنی بات پر ہی وہاں اکتفا کیا ہے، لیکن میں اس کو اس کے مناسب مقام پر مفصل طور پر بیان کر دوں گا اور اس کی وضاحت کروں گا۔ آپ کے اسی شہر لاہور سے مولانا غلام رسول مہر اور ان کے ساتھ چند دوسرے حضرات مولانا آزاد سے جا کر ملے تھے اور اسی مسئلہ پر ان سے سوالات کیے تھے۔ مولانا آزاد نے وہی جوابات دیے تھے جن کو میں بیان کر چکا ہوں۔

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

یہ سوالات و جوابات "میرا عقیدہ" کے نام سے اسی زمانے سے مطبوعہ موجود ہیں۔ جس میں مولانا آزاد نے صاف لفظوں میں کہا ہے میرا عقیدہ وہی ہے جو تمام مسلمانوں کا ہے۔

پھر مولانا آزاد نے سورہ فاتحہ کی جو تفسیر لکھی ہے وہ کس قدر اہم ہے۔ اس میں مولانا کی ادبیت اور اندازِ خطابت عروج پر ہے۔ بلاشبہ وہ مولانا آزاد کا شاہکار ہے۔ مولانا آزاد کا ذہن و فکر امام ابن تیمیہ رحمتہ اللہ علیہ اور ان کے شاگردِ رشید امام حافظ ابن قیم علیہ الرحمۃ سے شروع ہی سے بہت متاثر تھا۔ ان دونوں ائمہ سلف کے افکار کا مولانا آزاد کے دماغ پر بڑا غلبہ تھا۔ مولانا آزاد کا جو اپنا ذاتی عظیم الشان کتب خانہ تھا، میں نے وہ کتب خانہ خود دیکھا ہے۔ اس میں علامہ ابن تیمیہؒ اور علامہ ابن قیم کی تقریباً تمام تصانیف موجود تھیں علامہ ابن تیمیہ نے سورۃ التین اور سورۃ العصر کی بڑی جامع اور بڑی عجیب و غریب تفسیر کی ہے۔ مولانا آزاد کے سامنے ان اکابر کے تمام اہم مباحث تھے جن سے مولانا کافی متاثر تھے۔ لہٰذا سورہ فاتحہ کی تفسیر میں مولانا آزاد نے اللہ کی ربوبیت، اس کی رحمت اور اس کی ہدایت پر جو بحثیں کی ہیں، اگر آپ علامہ ابن تیمیہؒ کی تفاسیر محولہ بالا کو دیکھیں گے تو ان مباحث کا سررشتہ آپ کو ان کے یہاں مل جائے گا۔ لیکن مولانا آزاد کا اپنا خاص اسلوبِ نگارش ہے جو دل کو موہ لیتا ہے اور اس کے مطالعہ سے ذہن و قلب پر گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں مولانا آزاد نے اپنے ترجمہ میں یہ خاص بات پیش نظر رکھی ہے کہ جو تاریخی اہم مباحث قرآن مجید میں وارد ہوئے ہیں ان پر مولانا نے کافی تحقیق کے بعد بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ مثلاً ذوالقرنین کون تھے؟ ذوالقرنین کے متعلق ہمارے متقدمین نے یہ لکھا ہے کہ اس سے سکندر مقدونی مراد ہے۔ حالانکہ قرآن کا معمولی طالب علم بھی بہ ادنیٰ تامل یہ جانتا ہے کہ ذوالقرنین کے نام سے قرآن میں جس شخصیت کا ذکر کیا گیا ہے وہ ایک خدا آشنا اور خدا ترس شخصیت تھی جبکہ سکندر مقدونی ان اوصاف سے صرف محروم ہی نہیں بلکہ ان کے بالکل برعکس اوصاف کا حامل تھا۔ مولانا آزاد نے اس مسئلہ پر بڑی دقیق تحقیق کی ہے اور بڑی تفصیلی بحث کے بعد ثابت کیا ہے کہ ذوالقرنین سکندر مقدونی ہو ہی نہیں سکتا بلکہ وہ ایران کا ایک نیک خصلت بادشاہ کیخسرو تھا۔ مولانا آزاد کی اس تحقیق پر مولانا کے ہم عصر ایک صاحب علم نے ایک مضمون لکھا اور اس پر کچھ شکوک وارد کر دیے۔ محض شکوک وارد کرنے سے تو کام نہیں بنتا۔ سوال یہ ہے کہ اگر ذوالقرنین

© rasailojaraid.com

کیخسرو نہیں ہے تو آپ کے خیال میں وہ کون سی شخصیت تھی۔ اس کے لیے آپ کی تحقیق اور دلائل کیا ہیں؟ وہ یہ کام تو کر نہ سکے البتہ شکوک وارد کر دیے ــــ غرضیکہ ذوالقرنین کے متعلق تحقیق مولانا آزاد کا بہت بڑا کارنامہ ہے ــــ اسی طرح قرآن مجید میں اصحابِ کہف کا ذکر آتا ہے تو وہاں دو چیزیں بہت اہم ہیں ایک تو یہ کہ جس کہف کا قرآن میں ذکر ہے وہ کہاں پر واقع ہے! قرآن نے محض کہف کو کہف کے طور پر بیان نہیں کیا بلکہ اس کی ایک خصوصیت بھی بتائی ہے کہ یہ کہف اس طرح واقع تھا کہ وہاں دھوپ نہیں آتی تھی۔ اس کی پوزیشن اس طور پر تھی۔ دوسری یہ کہ وہاں رقیم کا لفظ آیا ہے۔ اب یہاں رقیم سے کیا مراد ہے؟ اس میں اختلاف ہے بعض اصحاب نے یہاں تک لکھ دیا کہ اصحابِ کہف کے کتے کا نام رقیم تھا۔ یہ کتنی لغو اور بے سروپا بات ہے۔ اب یہ تحقیق کرنی ہے کہ کہف کہاں تھا اور رقیم سے مراد کیا ہے! چونکہ مستشرقین قرآن مجید میں بیان کردہ ایسے واقعات کے متعلق کہہ دیتے ہیں کہ سنی سنائی باتیں اور داستانیں پیغمبر اسلام نے قرآن مجید میں درج کر دیں۔ ان کی تاریخی حقیقت کوئی نہیں ہے۔ تو مولانا آزاد نے اس کا بڑا اہتمام کیا کہ قرآن مجید میں تاریخی واقعات کے متعلق جو کچھ بھی آیا ہے، اسے اپنی تحقیق کے ذریعہ مکمل طور پر ثابت کریں تاکہ کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ہو کہ یہ محض ہوائی باتیں ہیں۔ اس بنا پر مولانا آزاد نے کہف کے متعلق بڑی تحقیق کی۔ انہوں نے آثارِ قدیمہ کی بے شمار کتابوں کا مطالعہ کیا اور اپنا یہ نظریہ قائم کیا کہ اردن میں عمان کے پاس جو پہاڑیاں ہیں، ان میں بے شمار کہف یعنی غار پائے جاتے ہیں۔ ان ہی میں ایک کہف (غار) ایسا ہے جو بالکل اسی کہف کا مصداق ہے جس کا قرآن مجید میں تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ پھر جہاں تک رقیم کا تعلق ہے تو مولانا نے اپنی تحقیق کے نتیجہ میں لکھا ہے کہ فلاں زمانہ میں ایک پادری کو ایک ذریعہ سے ایک غار میں مٹکہ میں رکھے ہوئے کچھ کاغذات ملے تھے۔ مولانا نے ان کاغذات کی دستیابی کی پوری داستان لکھی ہے آپ اس کو پڑھیں۔ مولانا آزاد کا کمال اصل میں یہ ہے کہ انہوں نے اپنی تحقیقات اس وقت لکھی تھیں جبکہ کہف اور رقیم کے متعلق تحقیق کا کام مکمل نہیں ہوا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب یہ تحقیقات مکمل ہو گئی ہیں جو مولانا آزاد کے نظریات کے مطابق ہیں جو مولانا نے اپنے دقیق اور تحقیقی مطالعہ سے قائم کیے تھے۔ چنانچہ اردن کے ایک

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

بہت بڑے فاضل ہیں جو ندوۃ العلماء کے جشن میں لکھنو تشریف لائے تھے۔ پھر دہلی بھی آئے مجھ سے ملاقات میں انہوں نے بتایا کہ یہ تحقیق مکمل ہوگئی ہے کہ اردن میں عمان کی پہاڑیوں میں وہ کہف موجود ہے جس کا قرآن میں ذکر ہے اور رقیم کا بھی پتہ چل گیا ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ انہوں نے اس موضوع پر تمام تحقیقاتی کام پر ایک کتاب بھی لکھی ہے جو شائع ہو چکی ہے۔ افسوس کہ وہ کتاب تاحال میرے مطالعہ میں نہیں آئی گو انہوں نے مجھ سے کتاب بھیجنے کا وعدہ کیا تھا لیکن شاید وہ بھول گئے۔ بہرحال مجھے اپنے چند احباب سے تصدیق حاصل ہوگئی کہ کتاب شائع ہو چکی ہے ــــ مولانا آزاد کا یہ تحقیقی کام وہ چیز ہے کہ جو انتہائی قابل ستائش ہے۔ پھر صرف اس پہلو ہی سے نہیں بلکہ اور بھی بے شمار پہلوؤں سے مولانا آزاد کی تفسیر ترجمان القرآن انتہائی قابل قدر خصوصیات کی حامل ہے۔ مولانا آزاد کی اس تفسیر کے اب تک بیس پارے شائع ہوئے ہیں دس پارے جو باقی رہ گئے، ان کی داستان یہ ہے کہ بعض لوگ یہ کہتے ہیں اور میں بھی ان ہی کے اندر شامل ہوں کہ مولانا آزاد نے بتلایا تھا کہ انہوں نے ان پاروں کی تفسیر مکمل کر دی ہے۔ میں نے یہ بات خود اپنے کانوں سے سنی ہے۔ لیکن وہ شائع نہیں ہوئی اور اب تک یہ پتہ بھی نہیں چل سکا کہ وہ کہاں ہے۔ مولانا آزاد کا ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو انتقال ہوا تھا اور یہ انتقال تین دن کے "کوما" (بے ہوشی) کے بعد ہوا تھا۔ مولانا کے یہ تین دن جو کوما میں گزرے تھے ان میں ان کی کوٹھی میں مختلف لوگ آتے جاتے رہے۔ ان کے سامان وغیرہ کو سنبھالنے والا کوئی نہ تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ بعض لوگوں نے مولانا کے بہت سے مسودات کو غائب کر دیا جن میں آخری دس پاروں کی تفسیر بھی شامل تھی چونکہ مولانا خود فرما چکے تھے کہ انہوں نے اس کی تکمیل کر لی ہے۔ واللہ اعلم

بہرحال مولانا آزاد کی جو شخصیت ہے اور ان کے متعلق جو کچھ میں نے عرض کیا ہے اس سے آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ وہ ایک خاص مشن کے آدمی تھے۔ ان کی دعوت وہی تھی جس کی طرف ہمارے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنی دو تقریروں میں اشارات کیے ہیں[1] لیکن ایک تو وہ مسلمانوں سے مایوس ہو گئے یعنی انہوں نے

---

[1] یہ تقاریر "جہاد بالقرآن" اور "اسلامی انقلاب کے لیے التزام جماعت اور شرط بیعت" کے عنوانات سے شائع ہو چکی ہیں۔ (مرتب)

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

محسوس کیا کہ مسلمانوں میں اتنی سکت نہیں ہے کہ وہ میری تحریک کا ساتھ دیں اور اس کے ساتھ چلیں اور دوسری طرف انہوں نے یہ دیکھا کہ انگریز عالم اسلام کا سب سے بڑا دشمن ہے اگر اس کو ہندوستان کی حکومت سے بے دخل کر دیا جائے تو اس کی کیفیت پَر کٹے پرندے کی ہو جائے گی — ممکن ہے کہ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے بعد ان میں تعاون سے محرومی کا بھی احساس پیدا ہوا ہو جس کی علمائے دیوبند کی اکثریت سے ان کو توقع ہو سکتی تھی — اس لیے انہوں نے استخلاص وطن کی جدوجہد کو اپنی جولان گاہ بنایا ہو — واللہ اعلم

البتہ یہ بات کہ مولانا آزاد کے پیش نظر آغاز میں تجدید دین اور احیائے اسلام ہی کا کام تھا جس کے لیے قرآن مجید ہی کو انہوں نے اپنی دعوت کا مرکز ومحور بنایا تھا۔ جس کا تذکرہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنی تقریر میں کیا ہے اس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ اس مسئلہ پر دو رائیں ممکن ہی نہیں ہیں۔ رہی یہ بات کہ جمعیت العلماء ہند نے جمعیت کے اجلاس میں مولانا آزاد سے اختلاف کیا۔ جس کی طرف ہمارے ڈاکٹر صاحب نے اشارہ کیا ہے تو میں خود تو اس اجلاس میں موجود نہیں تھا لیکن میں نے جو کچھ اپنے دوستوں اور بزرگوں سے سنا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ جمعیت العلماء کا ایک جلسہ دہلی میں ۱۹۲۰ء میں ہوا تھا جس میں اس بات کی تجویز زیر غور آئی تھی کہ مولانا آزاد کو امام الہند بنا دیا جائے اور اس جلسہ میں مولانا نے بڑی پُرجوش تقریر کی۔ تقریر اتنی پرجوش، ولولہ انگیز اور مدلل تھی کہ سب لوگ اس کے لیے تیار ہو گئے لیکن ہمارے دیوبند کے اکابر میں سے مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند، دونوں اس تجویز کے حامی نہیں تھے غالباً ہمارے استاذ حضرت مولانا انور شاہ کشمیری بھی ان کے ہم نوا تھے۔ میری معلومات کی حد تک ان کے حامی نہ ہونے کی وجوہ دو تھیں ایک تو یہ کہ ان اکابر کے نزدیک امام الہند ہونے کے لیے صرف علم وفن، خطابت اور تحریر اور ذہانت وفطانت اور طباعی کافی نہیں ہے۔ بلکہ تقویٰ اور طہارت بھی ہونی چاہیئے۔

اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ مولانا آزاد کا باوجود اپنے علم وفضل کے تقویٰ وطہارت میں وہ مقام نہیں تھا جو ہمارے علمائے دیوبند اور ہماری دوسری دینی درسگاہوں کے

© rasailojaraid.com

مشائخ کا تھا۔ صاف بات یہ ہے کہ مولانا آزاد کو اس بات کا احساس و ادراک ہی نہیں تھا اگر ہوتا اور وہ سجادہ نشین ہو کر بیٹھ جاتے تو آپ دیکھتے کہ ان کے والد سے سو گنا زیادہ لوگ ان کے مرید ہو جاتے چونکہ ان کے والد ماجد میں خطابت نہیں تھی، ادبیت نہیں تھی، خاص علمیت نہیں تھی جبکہ اللہ نے مولانا آزاد کو اس سے خوب نوازا تھا لیکن انہوں نے اس راستہ کو اختیار ہی نہیں کیا۔ پھر یہ کہ ان کا ظاہر و باطن یکساں تھا مثلاً وہ سگریٹ پیتے تھے تو یہ نہیں کہ چھپ کر پئیں۔ سب کے سامنے پیتے تھے

ظاہر بات ہے کہ تقویٰ کے اعتبار سے مولانا کا کوئی خاص مقام نہیں تھا۔ لہٰذا ہمارے چند علماء نے ان کے امام الہند بنانے کی حمایت نہیں کی تو اس کی پہلی وجہ یہ تھی کہ اس کے لیے تقویٰ و طہارت کی بھی ضرورت ہے اور مولانا آزاد میں اس کی کمی تھی۔

دوسری بات یہ کہ علماء متردد تھے کہ ان حالات میں کیا واقعی امام الہند کا منصب قائم کرنا چاہیئے! اس لیے کہ ان کے نزدیک امام وہ ہو سکتا ہے جس کے ہاتھ میں قوتِ تنفیذ ہو۔ یعنی محض زبانی بنا دینے سے تو کوئی امام نہیں ہو جاتا۔ ایسے شخص کو آپ اپنا رئیس، سردار کہہ سکتے ہیں۔ لیکن امام تو خلیفہ کے مترادف منصب ہے اور جب تک قوت تنفیذ نہ ہو کسی کو امام قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ غلام ہندوستان میں اگر مولانا کو امام بنا دیا تو اس کا مقام وہی ہو گا جیسے ایک لیڈر کا ہوتا ہے لیکن اسلام میں امام کا جو مفہوم ہے وہ تو ادا نہیں ہو گا لہٰذا مولانا کو امام الہند بنانے کی تجویز عملی صورت اختیار نہ کر سکی ـــــ مولانا معین الدین اجمیری کے متعلق جو بات سامنے آتی ہے اس کا مجھے علم نہیں ہے۔ لیکن اگر مولانا نے ایسی بات کہی بھی ہو تو کچھ زیادہ عجیب نہیں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مولانا معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے منطقی اور فلسفی تھے آپ جانتے ہیں کہ جو لوگ منطقی اور فلسفی ہوتے ہیں وہ بات کہنے میں زیادہ محتاط نہیں ہوتے۔ بسا اوقات وہ ایسی بات بھی کہہ جاتے ہیں جو ان کو کہنی نہیں چاہیئے۔ اگر انہوں نے کوئی ایسی بات کہی ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ پھر ایک بات، اور وہ یہ کہ دنیا میں اگر کسی شخص کا کوئی مخالف نہیں ہے تو سمجھ لیجیے کہ وہ بڑا آدمی ہے ہی نہیں۔ کوئی شخص بڑا آدمی اس وقت بنتا ہے جب کچھ لوگ اس کے مخالف ہوں۔ یہ تو لازمی بات ہے۔ بڑا آدمی وہی ہوتا ہے جو عام ڈگر سے ہٹ کر کوئی نئی راہ

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

پیش کرتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ یہ راستہ جس پر لوگ اندھا دھند چلے جا رہے ہیں، اس میں آگے کتنے خطرات ہیں۔ وہ دیکھتا ہے کہ مستقبل میں کیا ہونے والا ہے، کیا پیش آنے والا ہے۔ کیسی آندھی آنے والی ہے۔ وہ ان کو دیکھ کر قوم کو خبردار کرتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ایسے شخص کو ایک نئی راہ اختیار کرنی ہوگی۔ نیا اسلوب اپنانا ہوگا۔ اس وقت کے جو عوام ہوتے ہیں وہ اس کے متحمل نہیں ہوتے۔ اس لیے ان کے دلوں میں بیزاری پیدا ہوتی ہے لیکن جو لوگ زیادہ سمجھ دار ہوتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ داعی کتنی دور کی بات کہہ رہا ہے۔ وہ اپنے مستقبل میں کیا دیکھ رہا ہے، وہ اس کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ایک قافلہ بننا شروع ہو جاتا ہے اور وہ قافلہ ابتدا میں چھوٹا ہوتا ہے لیکن اگر استقامت سے دعوت کا کام جاری رکھا جائے اور مخالفتوں سے دل برداشتہ ہو کر ہمت نہ ہاری جائے اور اپنے موقف پر داعی ڈٹا رہے اور اپنی دعوت پیش کرتا رہے اور لوگوں کو تجربہ ہو کہ جس دعوت کو لے کر یہ لوگ اٹھے ہیں اس میں یہ مخلص ہیں اور یہ دعوت حقہ ہے تو اگر داعیوں میں استقلال اور ثابت قدمی ہو تو دعوت پھیلتی ہے اور قافلہ بڑھتا جاتا ہے یہ عام قاعدہ ہے تو حقیقت یہ ہے کہ مولانا آزاد نے جب یہ محسوس کیا کہ جو اصل دعوت ان کے پیش نظر ہے، اس کے لیے ابھی حالات سازگار نہیں ہیں تو انہوں نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ لیکن وہ بھی نہ صرف مسلمانانِ ہند کے مفاد میں تھا بلکہ پورے عالمِ اسلام کے مفاد میں بھی تھا اس لیے کہ انگریز کے پنجۂ استیلا میں تقریباً پورا عالمِ اسلام بالواسطہ یا بلاواسطہ گرفتار تھا۔ ہندوستان میں انگریز کی حکومت کے خاتمہ کا مطلب یہ تھا کہ اس کی گرفت کمزور ہو جائے اور دوسرے مسلمان ممالک بھی اس کی سیاسی و عسکری غلامی سے نجات حاصل کر سکیں۔

مولانا آزاد کے نقادوں نے مولانا کے خلاف بہت کچھ لکھا ہے۔ اس ضمن میں اصولی بات میں عرض کروں گا۔ وہ یہ کہ قرآن مجید فرماتا ہے کہ اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ۔ ”نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں“ —— مجھے بتایا جائے کیا کوئی آدمی ایسا ہے جو سراپا نیکی ہو۔ سراپا تقویٰ و طہارت ہو جس کے اندر اس کے منافی کوئی چیز نہ ہو اگر یہ ہے تو قرآن نے جو کہا ہے کہ فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا۔ تو اس کا کیا محل ہوگا، اس کے معنی تو یہ ہوتے کہ اس میں صرف تقویٰ پیدا کیا گیا ہے۔ فجور کا داعیہ پیدا نہیں کیا گیا۔ انسان کا کمال تو یہ ہے کہ فجور کا میلان ہو لیکن انسان شعوری طور پر اس سے بچنے کی کوشش کرے۔

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وسوسۂ نفس پر کوئی قدغن نہیں لگائی صحابہ کرامؓ نے کہا کہ حضورؐ ہمارے نفس میں گناہوں کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ تو حضورؐ نے فرمایا کہ ایسا ہونے پر کوئی مضائقہ نہیں۔ اس کے صدور سے بچنے کی کوشش کرو۔ میں عرض کرتا ہوں کہ اگر گناہ کی طرف آپ کے دل میں رغبت بھی پیدا نہ ہو تو آپ انسان نہیں فرشتے ہیں۔ انسان کو فرشتوں پر جو فضیلت حاصل ہے وہ اسی وجہ سے ہے کہ فرشتے تو اختیار و ارادہ رکھتے ہی نہیں۔ وہ تو مشین ہیں یا اس کے پرزے ہیں لہٰذا ان کو جس کام پر لگا دیا گیا ہے وہ اس کام کو انجام دے رہے ہیں۔ اس کے برعکس انسان کے اندر ارادہ ہے۔ اس کو اختیار بخشا گیا ہے۔ اس کے نفس میں تقویٰ اور فجور الہام کیا گیا ہے۔ اس کے باوجود وہ صحیح راستہ پر چلتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے جہاد کیا۔ وہ کشمکش سے دوچار ہوا ہے اس نے فجور کو چھوڑ کر تقویٰ کی روش اختیار کی ہے تو یقیناً اس کا مقام بہت بلند و ارفع ہوگا۔ ایک شخص لکھ پتی اور کروڑ پتی ہے اور وہ کہتا ہے کہ میں نے کبھی شراب کو ہاتھ تک نہیں لگایا تو یقیناً وہ بہت زیادہ قابلِ تعریف ہے۔ لیکن ایک شخص جو نانِ شبینہ کا محتاج ہے وہ مونچھوں پر تاؤ دے کر کہتا ہے کہ میں نے کبھی شراب نہیں پی تو ٹھیک ہے کام بہت اچھا ہے لیکن وہ اتنا قابلِ تعریف نہیں ہے جتنا ایک مالدار شراب سے مجتنب سمجھا جائے گا۔ ایک شخص جو نوجوان ہے۔ تندرست اور بڑا خوبصورت ہے وہ یہ کہتا ہے کہ الحمدللہ میں نے آج تک کسی عورت کی طرف بری نگاہ سے نہیں دیکھا یقیناً یہ نوجوان نہایت قابلِ تعریف ہے لیکن ایک نابینا یہ کہتا ہے کہ میں نے آج تک کسی عورت کو بری نگاہ سے نہیں دیکھا تو اس نے کونسا تیر مارا۔ تو زندگی کا یہ فلسفہ ہے۔ پس اس بنا پر ہمیں ہر بڑے شخص کو اس طرح نہیں دیکھنا چاہیئے کہ گویا وہ فرشتہ ہے۔ یہ تو صرف رسولوں کا خاصہ ہے کہ وہ بالکل معصوم ہوتے ہیں۔ پھر ہمارے صحابہ کرامؓ کی خصوصیت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضِ صحبت نے ان کو اس مقام پر پہنچا دیا تھا۔ کہ انہوں نے نفس کے بے قابو گھوڑے کے منہ پر لگام ڈال رکھی تھی لہٰذا ہمیں ہر بڑے شخص کو سنجیدگی کے ساتھ اس نگاہ سے دیکھنا چاہیئے کہ کسی بڑے شخص میں اچھی چیزوں کا تناسب کیا ہے! اگر ان کا غلبہ ہے تو ان کی چھوٹی چھوٹی لغزشوں کو نظر انداز کر دینا چاہیئے۔ حاشا و کلا اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ مولانا آزاد میں کسی نوع کا فجور تھا۔ معاملہ صرف

(بقیہ ص [illegible] پر)

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com